مقالاتِ شبلی پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد سلیم ☆

Abstract

This article analyses and critically examines some of the very interesting articles from "Maqalat-e-Shibli" by Maulana Shibli Naumani. While reading these articles, one realizes the extent and depth of his knowledge, his keen intellect, his elegance and also the direction of his thoughts. Even today, heart and mind are fragrant with the odour of flowers he has made to bloom in the fields of literature, history, poetry, philosophy and education. His literary splendour is like that of a pruned diamond glittering from every side. While writing theses articles, his thought usually reaches the heights and attains the brilliance of galaxies and to achieve the pearls of his objectives, he can get down to unfathomable depth of sea. It has been tried to reflect and project these facts in this article; of course, differing with some of his views.

مولانا شبلی نعمانی ایک جامع الفنون عبقری تھے۔ اسلامی علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ ایک ایسے سنگ تراش تھے جو اپنے قلم سے حسین و جمیل مجسمے تراشتا اور اپنی انشاپردازی سے ان میں روح پھونک دیتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں شگفتگی اور رعنائی ہے اور ان کی تحریروں میں شہد کی مٹھاس۔ مشکل سے مشکل موضوع پر لکھتے وقت بھی ان کی تحریر کی دلآویزی اور دل کشی قائم رہتی ہے اور ان کا اسلوب ان کے علم و فضل کی عظمت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

☆ پروفیسر ایمریطس، مرکز برائے ہائی انرجی فزکس، جامعہ پنجاب، لاہور

مولانا شبلی نعمانی پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔انشا پرداز کی حیثیت سے انہوں نے اردو نثر کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔مؤرخ اور سوانح نگار کے طور پر انہوں نے نئی راہیں کھول دیں۔مدلل انداز بیان اور تجزیہ نگاری سے اردو میں ایک نئے رجحان کا آغاز کیا۔اردو،عربی اور فارسی کے لٹریچر پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا اور فرانسیسی زبان سے بھی آشنا تھے۔ان کا منفرد اسلوب نہایت دلآویز ہے۔وہ شاعر اور نقاد بھی تھے۔ان کی فارسی شاعری انہیں ہندوستان کے صف اول کے فارسی شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔ فارسی شاعری کے نقاد کی حیثیت سے اس دور میں کوئی بھی ان کا ہم پلّہ نہیں۔ان کی بہت سی تصانیف سو سال سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح جگمگا رہی ہیں اور ان کے لیے ہنوز ذوق وشوق کی فراوانی ہے۔وہ تجدید پسندی کے ضرور قائل تھے لیکن اپنی روایات سے رابطہ توڑے بغیر اور اسی روش نے انکی تحریروں کو جلا بخشی۔

وہ اردو زبان کے پہلے مؤرخ ہیں جنہوں نے سوانح لکھتے وقت اس دور کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کو نمایاں کیا،واقعات کا تجزیہ کر کے اسباب کی نشان دہی کی اور ہر جگہ مستند ماخذوں کے حوالے دیے۔مسلمان مؤرخین میں سے قدما اپنی تصانیف میں بڑے سلیقے سے اس دور کی تہذیب وتمدن پر بھی روشنی ڈالتے جاتے تھے لیکن متاخرین نے اس خصوصیت کو ترک کر دیا تھا۔شبلی نے قدیم انداز کو تازہ کیا۔ان کے قلم کا غبار کبھی کبھی انشا پردازی کی کہکشاں کو بھی چھونے لگتا ہے۔ ادبی تنقید میں بھی وہ بےنظیر تھے۔''شعرالعجم'' ان کی ادبی زندگی کا سرمایہ ہے۔وہ ایک ایسی قندیل تھے جس سے علم وفن کی محفلیں روشن تھیں۔علم کلام کی تاریخ اور علم کلام پر کتابیں لکھیں تو دقیق فلسفیانہ مباحث پر ان کی ژرف نگاہی،زبان کی شگفتگی اور سلاست بیان نے سب سے خراجِ تحسین وصول کیا۔بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ سارا علم ان کے سامنے بکھرا پڑا ہے۔جس موضوع کو بھی ضروری سمجھتے ہیں،اسے چن لیتے ہیں۔

مولانا شبلی نے درجنوں بلند پایہ مقالات لکھے ہیں جو آٹھ جلدوں میں ''مقالات شبلی'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔انہیں پڑھ کر مولانا کے علم کی وسعت اور گہرائی اور سوچ کی سمت کا اندازہ ہوتا

ہے۔تاریخ، ادب، فلسفہ، تعلیم اور شاعری کے خیابانوں میں انہوں نے رنگارنگ جو نئے پھول کھلائے، ان کی خوشبو سے آج بھی دل ودماغ معطر ہیں۔ان کی علمی چمک دمک ایک ایسے تراشے ہوئے ہیرے کی تھی جو ہر پہلو سے جگمگا رہا ہو۔

جلد اول میں مذہبی مضامین ہیں۔ایک اہم مضمون جزیہ کے بارے میں ہے۔ ہندوستان میں انگریز راج کے شروع ہوتے ہی ایک طرف عیسائی مشنریوں اور ہندو آریہ سماجیوں نے مسلمانوں کے لیے تبدیلی مذہب مہموں کا آغاز کیا تو دوسری طرف شکست خوردہ مسلمان قوم نے مرعوبیت کی سیاہ چادر اوڑھ لی جس سے انگریزی تہذیب کی شعاؤں کی حرارت سے ان کے دل وجان پگھلنے لگے۔لیکن معروف شخصیتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق ان کا رد کرنے کی سعی کی۔شبلی نے بھی اپنے زمانے میں بھرپور رول ادا کیا۔مثلاً جب جزیہ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اسلام اس کا موجد ہے اور مسلمانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر یہ ٹیکس عاید کیا تھا تا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے مجبور ہوکر اسلام قبول کرلیں تو مولانا نے اس کی مدلل تردید کی۔انہوں نے بتایا کہ جزیہ فارسی لفظ گزیہ کا معرب ہے۔اس کے معنی خراج کے ہیں۔اور یہ ایجاد ہے ایرانی شہنشاہ نوشیرواں کی۔اس نے اپنی رعایا کے ان افراد پر یہ ٹیکس کے طور پر عاید کیا تھا جو فوجی خدمات سرانجام نہ دے سکتے تھے۔کمال یہ ہے کہ نوشیرواں تو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے عادل ٹھہرا اور وہی کام کرنے پر مسلمان ظالم و جابر وستم گر ٹھہرے۔اسلامی حکومت میں ہر مسلمان کو فوجی خدمت کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن غیر مسلموں کو نہیں۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ غیر مسلم اپنی محافظت کے لیے حکومت کو کوئی معاوضہ دیں۔ اسی معاوضہ کا نام اسلام میں جزیہ تھا۔یہ غیر مسلم رعایا کی حفاظت کا ٹیکس تھا، کافر ہونے کا تاوان نہ تھا۔ اگر کسی موقع پر غیر مسلم فوج میں شامل ہوجاتے تو جزیہ سے بری کردئے جاتے۔(۱)

اسی جلد میں دو مضامین ''علوم القرآن'' اور ''اعجاز القرآن'' ہیں۔شبلی نعمانی پوچھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآنِ مجید کا معجزہ ہونا اس کی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ہے لیکن کیا ہمارے علماء اس دعوے کو ثابت کرسکتے ہیں۔اگر ان سے پوچھا جائے کہ قرآن مجید کی انشا پردازی کی کیا

خصوصیات ہیں،قرآن مجید نے بلاغت کے کیا کیا نئے اسلوب پیدا کیے۔۔۔ تو کیا ہزاروں علماء میں سے ایک بھی ان سوالوں کا معقول جواب دے سکے گا؟قرآنِ مجید کی فضیلت کے بیان میں اس کو ناصح، رہنما، بشیر، نذیر، نور، حلیم، واضح، سب کہا لیکن فصاحت و بلاغت کا کہیں نام تک نہیں آیا۔اور وہی چیز چھوڑ دی گئی جو لوگوں کے نزدیک مدارِ اعجاز ہے۔کیا ہدایت اور حکمت کے لحاظ سے کوئی کتاب قرآن کا جواب ہوسکتی ہے؟ اگر نہیں ہوسکتی (اور یقیناً نہیں ہوسکتی) تو یہ اوصاف کیوں معجزہ نہ ہوں اور وہ وصف معجزہ ہو جس کا ذکر تک قرآن میں نہیں۔اس کے یہ معنی نہیں کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا جواب ہو سکتا ہے۔بے شبہ نہیں ہوسکتا اور قیامت تک نہیں ہوسکتا۔لیکن کتاب آسمانی کا رہنمائے عالم ہونا معجزہ ہوسکتا ہے نہ کہ نثاری اور انشا پردازی۔(۲)

اس موقع پر مولانا شبلی نعمانی اس بنیادی بات کو نظر انداز کر گئے کہ قرآن مجید نے عربوں کو چیلنج کیا تھا کہ اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔کسی کو چیلنج اسی کے میدان میں کیا جاتا ہے۔آپ کسی حلوائی کی دکان پر جا کر اس کو یہ چیلنج نہیں کرتے کہ یہ میری غزل ہے، اس کے مقابلے پر اپنی غزل لاؤ۔آپ تو اس کے سامنے اپنی بنائی ہوئی مٹھائی پیش کریں گے اور کہیں گے کہ ایسی مٹھائی بنا کر دکھاؤ تو مان جائیں گے۔عربوں کو اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا۔عرب اپنے علاوہ کو عجمی کہتے تھے۔قرآن نے ان کو انہیں کے میدان میں چیلنج کیا۔اس لیے مولانا کا یہ کہنا کہ قرآنِ مجید نے کبھی فصاحت و بلاغت کا دعویٰ نہیں کیا، صحیح نہیں۔اور واقعی یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ اس نے عربوں کو اسی میدان میں صفر کر دیا جس میدان کے وہ اپنے آپ کو شہسوار سمجھتے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی کے زمانے میں قاضی باقلانی کی اعجاز القرآن چھپ کر آ گئی تھی اور ندوۃ العلماء میں داخل نصاب تھی۔مگر مولانا اسے ایک کمزور تصنیف سمجھتے تھے۔چنانچہ لکھتے ہیں: اس کتاب کی نسبت ابن العربی کا قول ہے کہ اس بحث پر کوئی کتاب اس درجہ کی تصنیف نہیں ہوئی۔(۳) ابن العربی کی رائے پر اگر اعتماد کیا جائے تو اسلاف کی علمی حالت پر سخت افسوس ہوگا کیونکہ باقلانی کی کتاب کو انشا پردازی کے لحاظ سے بلند رتبہ ہے لیکن اصل مضمون کی حیثیت سے محض ایک ملایا نہ تصنیف

ہے۔البتہ شبلی نے اس موضوع پر عبدالقاہر جرجانی کی تحریروں کی تعریف کی ہے اور انہیں فنِ بلاغت کا موجد قرار دیا ہے۔اعجازِ قرآن کے سلسلے میں مولانا انور شاہ کشمیری کہتے تھے: مجھے منجانب اللہ اس فن میں خداداد ذوق حاصل ہے اور کسی چیز کی فصاحت و بلاغت کا فیصلہ کرنے میں متقدمین ومتاخرین کا پابند نہیں ہوں۔درس میں مشہور مقولہ نقل کرتے کہ اعجاز قرآن کو سمجھنے والے دو ماہرین ہیں: علامہ زمخشری اور علامہ قاہر جرجانی۔پھر مسکرا کر کہتے کہ تیسرا میں ہوں!(۴)

اسی جلد میں شبلی نے ''وقف اولاد'' کے عنوان سے ایک اہم مضمون لکھا ہے(۵)۔لیکن جلد ہشتم میں اسی موضوع پر ان کے اور مضامین بھی ہیں۔ہم ان سب پر آخر میں تبصرہ کریں گے۔

جلد دوم میں ادبی مضامین ہیں۔سرسید کی وفات کے چند ہفتوں بعد مئی 1898ء میں اپنے مضمون ''سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر'' میں شبلی لکھتے ہیں کہ جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان (سرسید) کی اصلاح کی بدولت ذرّہ سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ان ہی کی بدولت اردو زبان اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔(۶)

سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے۔اور جس مضمون کو لکھا ہے، اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گذرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے۔سعدی رزم کا مردِ میدان نہیں۔نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں۔ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا

ہے اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے۔(۷) اردو لٹریچر کے حوالے سے سرسید کی اس سے زیادہ اور کیا تعریف ہوگی۔

شبلی لکھتے ہیں کہ سرسید کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ۔(۸) مولوی علی بخش خاں جو سرسید کے رد میں رسالے لکھا کرتے تھے، حرمین شریف گئے اور وہاں سے سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔اس پر سرسید نے تہذیب الاخلاق میں لکھا: جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے ہوئے فتووں کے دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں:

بہ بیں کرامتِ بت خانہ مرا اے شیخ کہ چوں خراب شود، خانۂ خدا گردد

شبلی عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے فاضل تھے لیکن شعر وشاعری میں ان کا رجحان فارسی کی طرف تھا۔چنانچہ اپنے مضمون ''عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ'' میں لکھتے ہیں: ایران آب وہوا اور زمین کی شادابی کی وجہ سے بہشت کا چمن زار ہے۔اس لیے ایرانی شاعری کے لیے تشبیہات کا جو سرمایہ ہاتھ آسکتا تھا، عرب کو نصیب نہیں ہوسکتا تھا۔مثلاً عرب کا شاعر دہن کی تعریف میں بڑی قوت تخئیل صرف کرتا ہے تو انگوٹھی کے حلقے سے تشبیہ دے کر رہ جاتا ہے۔لیکن ایران کا خیال بند، درج گوہر، چشمہ نوش، پستہ، غنچہ، ذرۂ جوہر فردوس کچھ دے جاتا ہے اور پھر اس کی تشبیہ کا خزانہ خالی نہیں ہوتا۔ امراءالقیس عرب کا سب سے بڑا شاعر معشوق کی انگلی کو مسواک اور سروع سے تشبیہ دیتا ہے جو جنگل کا ایک کیڑا ہوتا ہے لیکن فارسی کا شاعر اسے دمِ قاقم سے تشبیہ دیتا ہے۔(۹)

جلد دوم کے مضمون ''نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ'' میں اپنے عزیز مولانا حمید الدین فراہی کی علمیت اور ان کی بے نیازی کی بہت تعریف کی ہے۔لیکن درج ذیل عبارت لکھ کر بغیر تبصرے کے خاموشی سے آگے نکل گئے ہیں: ''(وائسرائے ہند) لارڈ کرزن جب سواحلِ عرب کی مہم پر گئے تھے تو یہ بھی ساتھ تھے۔اور سردارانِ عرب کے سامنے عربی زبان میں لارڈ کرزن کی طرف سے جو تقریر پڑھی گئی، وہ انہی کی لکھی ہوئی تھی''۔(۱۰)

جلد سوم میں تعلیمی مضامین ہیں۔ پہلا مضمون ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' ہے۔علی گڑھ آنے کے بعد یہ ان کا پہلا تحقیقی مضمون ہے جو انہوں نے 8 مئی 1887ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں پڑھا۔علمی حلقوں میں یہ مضمون بے حد پسند کیا گیا۔اس میں انہوں نے مسلمانوں سے منسوب کردہ غلط واقعات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا مثلاً اسکندریہ کے کتب خانے کو مسلمانوں کے ہاتھوں جلائے جانے کی روایت۔اس مضمون سے ان کی شہرت مُشک کی خوشبو طرح برصغیر میں پھیل گئی اور ان کا شمار ایک عظیم مسلم سکالر کے طور پر ہونے لگا۔

اس مضمون میں انہوں نے ان امور پر بحث کی ہے کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کس طرح حاصل کیے اور دنیا کی تمام قوموں کو ان علوم کی کیونکر تعلیم دی۔شبلی لکھتے ہیں: اسلام سے پہلے کو عرب کی اقوام رسمی علم وفنون سے بالکل بے بہرہ تھیں تاہم ان خانہ بدوش صحرائیوں میں علمی مذاق کی جان پائی جاتی تھی۔نظم ونثر ان کا سرمایۂ خمیر تھا لیکن وہ طوطی وبلبل کی طرح محض نیچرل فصیح اللسان نہ تھے بلکہ فصاحت و بلاغت کے دقیق نکتوں تک ان کی نگاہ پہنچتی تھی۔اسلام نے آکر مذہب ومعاشرت کے ساتھ ان کی علمی زندگی بھی بالکل بدل دی۔قرآنِ مجید کی پر تاثیر آیتوں نے شعرا اور خطیبوں کی زبانیں بند کر دیں۔قرآن کی برابری کرنے کے حوصلے بہت جلد پست ہو گئے۔اب شعرا اور خطیبوں کے لیے قرآن خود رہنما بنا اور فصاحت و بلاغت کے بہت سے نئے اصول سکھا دیے۔زبان نہایت شستہ و صاف ہوگئی۔اور اونٹ بکری کے قصوں کے علاوہ شعراء کو اخلاق اور تربیت کے بہت سے مضامین ہاتھ آئے۔(۱۱)

شبلی لکھتے ہیں: اس زمانہ میں دو علم مذہبی ضرورت سے ایجاد ہوئے۔علم البیان وکلام۔اسلام کا بڑا معجزہ جو ہمیشہ استعمال کیا جا سکتا ہے، قرآن تھا۔اس کے معجزہ ہونے کا دعویٰ جب جب اہلِ عرب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔کفارِ عرب کو انکار کرنا چاہتے تھے مگر ان کا مذاقِ زبان دانی اس دعویٰ کے تسلیم کرنے پر انہیں مجبور کرتا تھا۔وہ منہ سے انکار کرتے تھے مگر قرآن پڑھے جانے کے وقت ان کی بے اختیاری حالت، بے قصد تحسین، بے تابانہ تاثر، ان کے

اظہار کے خلاف شہادت دیتے تھے۔لیکن یہ ضروری ہوا کہ اہلِ عجم کے لیے فصاحت اور بلاغت کے اصول مرتب کیے جائیں۔(۱۲)

علمِ کلام اس وقت پیدا ہوا جب یونانی علم کے شائع ہونے سے مذہب اسلام فلسفہ سے ٹکرا گیا۔ محققینِ اسلام نے پرزور منطقی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ فلسفۂ یونانی جس قدر کہ اسلام کے اصلی مسائل سے مختلف ہے، خود غلط اور باطل ہے۔امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ اس فن میں پہلی تصنیف ہے جس کا تتبع امام رازی وغیرہ نے کیا اور اس ترقی کو پہنچایا کہ تہافتہ تقویمِ پارینہ کے برابر ہوگئی۔(۱۳)

مولانا شبلی رقم طراز ہیں: سچ یہ ہے کہ افلاطون وارسطو وغیرہ کے ناموں کو عموماً اسلامی ممالک نے جو عزت دی، یونان میں ان کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔لیکن مسلمانوں نے ایک ذرہ پایا تھا، اسے آفتاب بنادیا۔ ہیئت کو بہت کچھ ترقی دی۔طبعیات کے متعلق ارسطو کی بہت سی غلطیاں دریافت کیں۔منطق کو بالکل نئے طرز سے ترتیب دیا اور چند اصول اضافہ کیے۔نئے نئے آلاتِ رصدیہ ایجاد کیے۔نور کی رفتار دریافت کی۔علم مناظر انعکاس کا قاعدہ معلوم کیا۔جبر ومقابلہ جو چند جزئی مسئلوں کا نام تھا، ان ہی کی طباعی سے ایک علم کے رتبے تک پہنچ گیا۔ ۔۔۔ کیمسٹری کی ان ہی نے بنیاد ڈالی۔ ۔۔۔ غرض آج یونانی عربی تصنیفات کا کوئی شخص موازنہ کرے تو قطرہ ودریا کا فرق پائے گا۔(۱۴)

اس دور میں ترجمے بھی خوب ہوئے اور مسلمانوں نے بہت سے علوم کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔تفصیل سے بحث کرنے کے بعد، مولانا شبلی نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ چونکہ ہمارے اسلاف نے ترجمے کر کے یونانی علوم پر عبور حاصل کر لیا تھا اس لیے ہم بھی انگریزی سے ترجمے کر کے علوم وفنون میں یورپی اقوام کے برابر آجائیں گے۔اس لیے کہ

1۔ترجموں کا جو اہتمام اس زمانے کے لاکھوں روپے خرچ کر کے بنی عباس کے دور میں ہوا، وہ اب ناممکن ہے۔کروڑوں روپے جو ترجموں کے لیے اب درکار ہوں گے، کہاں سے آئیں گے؟

2۔دوسرے اس زمانہ میں نہ صرف علوم محدود تھے بلکہ ترقی بھی رک چکی تھی۔ترجموں سے یونانیوں کے

تمام علوم کا احاطہ کر لیا گیا اور پھر ان پر ترقی دی گئی۔ لیکن اس زمانے میں نہ تو علوم کی ترقی کی کوئی انتہا ہے اور نہ ان کتابوں کا کوئی شمار ہے جو دھڑا دھڑ لکھی جا رہی ہیں۔

3۔ تیسرے اس زمانہ میں تمام ترجمے عربی زبان میں ہوئے جو تمام اسلامی ممالک میں حکومت کرنے والی زبان تھی۔ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہیں کہ کسی قوم نے اس زبان میں علوم وفنون کو ترقی دی ہو جو ان پر حکومت کرنے والی نہیں ہے۔(۱۵)

شبلی یہ بھی لکھتے ہیں: ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہے کہ خود سید احمد خاں صاحب نے جو سائنٹیفک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔(۱۶)

سید صباح الدین لکھتے ہیں کہ جب یہ مضمون پڑھا جا رہا تھا تو انگریزی تعلیم یافتہ سامعین میں سے لوگ اٹھ اٹھ کر پوچھتے: مولانا! کیا ہمارا علمی ماضی ایسا ہی شاندار تھا جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں۔(۱۷)

جلد چہارم میں 17 تنقیدی مضامین ہیں۔ تنوع قابل داد ہے اور کئی ایک میں انشا پردازی اپنے کمال پر ہے۔ مآثر رحیمی اور ہمایوں نامہ پڑھ کر بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ مآثر رحیمی کے مطالعہ سے عبدالرحیم خانِ خاناں کی عظمت کا آفتاب، دل ودماغ منور کرتا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی ''طبقات ابن سعد'' پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: یہ کتاب بارہ ضخیم جلدوں میں ہے۔ ایک جرمن فاضل پروفیسر شاخو نے شہنشاہ جرمنی کی مالی اعانت سے تلاش بسیار کے بعد متعدد نسخوں کا پتہ لگایا اور ان کی تصحیح اور مقابلہ شروع کیا۔ مدت کی محنت کے بعد ایک جلد شائع ہوئی ہے۔ یہ جلد تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ محدثین نے تصریح کی ہے کہ ابن سعد ثقہ اور صادق الروایہ تھے۔ ابن سعد کی کتاب میں صحابہ کے حالات میں جو تفصیل اور جامعیت ہے، متاخرین محدثین کی کتابوں کو اس سے کچھ نسبت نہیں۔(۱۸)

امام رازی کی تفسیر کبیر کے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں نے بہت سی اہم اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ امام رازی اس تفسیر کو مکمل کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ اکثر لوگوں کو اس

بات کا علم ہی نہیں ۔اس تفسیر کا باقی حصہ شیخ نجم الدین احمد اور شہاب الدین بن خلیل نے لکھا۔تکملہ لکھنے والوں نے امام رازی کے طرز کو اس قدر محفوظ رکھا کہ ذرہ برابر فرق نہیں نظر آتا ۔امام رازی کا یہ مخصوص وصف ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مطلب کو اس قدر آسان اور سہل کر کے لکھتے ہیں کہ بچہ تک سمجھ سکتا ہے۔اس خصوصیت میں تمام علمائے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں ہوسکا۔لیکن تفسیرِ کبیر کے تکملہ نگاروں نے اس طرز کو اس کمال تک پہنچایا کہ خود گم ہوگئے اور آج دنیا ان کی تحریر کو بھی امام رازی کی تحریر سمجھ رہی ہے۔تفسیرِ کبیر کی آٹھ جلدوں میں سے سات جلدیں خود امام کی تصنیف ہیں۔کل زمانہ تصنیف کم و بیش آٹھ برس ہے۔اس تفسیر کا انداز تمام تفسیروں سے الگ ہے ۔اس لیے بعض تقلید پسندوں نے نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا۔ابو حیان کہتے ہیں کہ اس کتاب میں بہت سی فضول باتیں جمع کر دی ہیں جن سے فنِ تفسیر کو کوئی تعلق نہیں۔اسی بنا پر بعض علماء نے کہا کہ اس تفسیر میں اور سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں ہے!امام رازی سے پہلے جس قدر تفسیریں لکھی گئی تھیں،خاص خاص موضوع پر تھیں۔بعض میں صرف احادیث اور آثار جمع کیے تھے۔بعض میں فنِ بلاغت اور عربیت سے بحث تھی۔بعض میں صرف فقہی احکام کو طول دیا تھا۔بعض میں عقلی مباحث تھے۔تفسیر کبیر پہلی تفسیر ہے جس میں تمام حیثیتیں جمع کی ہیں۔اس لحاظ سے وہ گویا تمام تفاسیر کا مجموعہ ہے۔(۱۹)

امام رازی پر یہ عیب لگایا جاتا تھا کہ وہ نہایت قوی شبہات پیدا کرتے ہیں اور ان کے جواب میں عاجز آجاتے ہیں۔(۲۰)مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے کہ قرآن حکیم کا اپنا فطری انداز بیان اور طریق استدلال ہے جو ہمارے وضع کئے ہوئے طریقوں کا پابند نہیں۔چنانچہ صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے،تو سنتے ہی اس کی حقیقت پا لیتے تھے۔لیکن یونانی علوم کے تراجم نے علوم وفنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا اور (رفتہ رفتہ) قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں۔چنانچہ صدر اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ مفسرین نے قرآن کی باتوں کو وضعی اصولوں کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھیں،اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہونے لگے۔امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر لکھی اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا

اس مصنوعی لباس وضعیت سے آراستہ ہو جائے۔ اس سے شکوک کے بے شمار دروازے کھل گئے۔ ان کے کھولنے میں تو امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا لیکن بند کرنے میں تیزی نہ دکھا سکے۔ اسی سوچ کی بنا پر امام ابن تیمیہ وغیرہ نے علم کلام کی مخالفت کی۔ (۲۱)

گلبدن بیگم بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن تھی۔ اس نے اپنے دور کے حالات کے بارے میں ایک کتاب ''ہمایوں نامہ'' لکھی ہے۔ یہ کتاب تقریباً نایاب ہو چکی تھی کہ یورپ کی ایک خاتون لیڈی بیوریج نے تلاش بسیار کے بعد اسے دریافت کیا اور 1902ء میں لندن سے شائع کیا۔ ہمایوں نامہ انشا پردازی کا نادر نمونہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ، عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی اس کتاب میں بے حد دل کشی پیدا کر دیتی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کمال کی تصنیف ہے۔ اس کتاب سے اس زمانے کی معاشرت اور خانگی زندگی کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ''ہمایوں نامہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے شبلی نے اپنے بارے میں یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے: مدت ہوئے جب میں علی گڑھ میں پروفیسر تھا۔ ایک بار پرنسپل نے مجھ سے کہا کہ گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ کہاں ملے گا؟ لندن سے ایک خاتون نے اس کا پتہ پوچھا ہے۔ مجھ کو اپنی تاریخ دانی پر ناز تھا۔ میرا غرور توڑنے کے لیے یہ کچھ کم بات نہ تھی کہ میں ہمایوں نامہ ایک طرف، سرے سے گلبدن بیگم کو نہیں جانتا تھا۔ (۲۲) یہ بات شبلی کے کریڈٹ میں جاتی ہے کہ انہوں نے ایک خاص کتاب اور شخصیت کے بارے میں اپنی ناواقفیت سے سب کو خود ہی آگاہ کر دیا۔

اس کتاب سے اس زمانے کی تہذیب و معاشرت کے جو حالات معلوم ہوتے ہیں، ہم ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں[23]:

1۔ عورتیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فنونِ سپہ گری سے خوب واقف ہوتی تھیں۔ اور سفر اور سیر و شکار میں عموماً گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض عورتیں مردانہ لباس پہنتی تھیں۔

2۔ عورتوں کا نہایت احترام کیا جاتا تھا۔ بابر کی بیوی ماہم بیگم جب کابل سے ہندوستان آئی تو بابر دو کوس تک پا پیادہ استقبال کے لیے گیا۔

3۔آج یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ اس وقت عورتوں کو اپنی شادی اور نکاح کے معاملہ میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ ہمایوں نے جب حمیدہ بانو بیگم سے شادی کرنی چاہی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور مدت تک اپنے ارادہ اور ضد پر قائم رہی۔اور جب معزز بیگمات نے کہا کہ کسی سے شادی کرنا ہے ہی، تو بادشاہ سے کیوں احتراز؟ اس پر حمیدہ بانو نے کہا کہ میں اس سے شادی کروں گی جس سے برابری کا دعویٰ ہو سکے۔بادشاہ کا اور میرا جوڑ کیا۔

4۔اس کے بعد شبلی مزے لے لے کر لکھتے ہیں: لیکن ہمارے زمانے کے پردہ شکن گروہ کو یہ سن کر مایوسی ہوگی کہ ان سب باتوں کے ساتھ عورتیں نامحرم سے پردہ کرتی تھیں اور بغیر نقاب اور برقع کے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ہمایوں نے نکاح سے پہلے جب حمیدہ بانو کو بلایا ہے تو اس نے کہا کہ آدابِ سلطنت کے لحاظ سے ایک دفعہ میں بادشاہ کے سلام کو جا چکی ہوں۔ دوبارہ جانا، نامحرم کے سامنے جانا ہے۔چنانچہ جب تک شادی نہیں ہوئی، کبھی ہمایوں کے سامنے نہیں آئی۔

5۔بابر اور ہمایوں اسی طرح اپنے عزیزوں سے ملتے جلتے تھے جس طرح ایک عام آدمی اپنے پیارے عزیزوں سے ملتا ہے۔

مآثر رحیمی عبدالباقی کی تصنیف ہے۔یہ اکبر بادشاہ کا سپہ سالار عبدالرحیم خانِ خاناں کے حالات پر ہے۔1906ء میں شبلی کلکتے گئے تو ایشیاٹک سوسائٹی میں مآثر رحیمی کا ایک نسخہ ان کی نظر سے گزرا جو دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں خان خاناں کی فتوحات، تعلیم و تربیت، فضائل اخلاق، علمی لیاقت، انشا پردازی، شاعری، سپہ گری، اور دربار شاہی سے تعلقات وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مولانا شبلی نعمانی نے اس تصنیف پر ایک ریویو لکھا ہے اور عبدالرحیم خانِ خاناں کی زندگی کے بہت سے دلچسپ واقعات درج کئے ہیں۔عبدالرحیم خانِ خاناں مختلف زبانوں میں کمال رکھتا تھا۔عربی زبان میں یہ مہارت تھی کہ کہیں سے کوئی عربی تحریر آتی تو بغیر اس کے کہ اصل عبارت پڑھے، اس طرح ترجمہ کرتا کہ گویا کوئی لکھی ہوئی تحریر ہاتھ میں ہے جسے دیکھ کر پڑھتا جاتا ہے۔ایک دفعہ شریفِ مکہ نے اکبر کو خط لکھا اور عبارت آرائی کے لیے بڑے بڑے مغلق اور دقیق الفاظ بھر دیے۔اکبر نے ابوالفضل،

فتح اللہ شیرازی اور خانِ خاناں کو حکم دیا کہ فارسی میں ترجمہ کر کے لائیں۔ابو الفضل اور فتح اللہ شیرازی دونوں اس خیال سے کہ ترجمہ کرنے کے لیے لغت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوگی، تحریر کو ساتھ لے گئے۔لیکن خانِ خاناں نے وہیں روشنی کے سامنے لے جا کر خط پڑھنا شروع کیا اور ساتھ کے ساتھ ترجمہ کرتا گیا۔(۲۴) یاد رہے کہ فتح اللہ شیرازی وہ شخص ہے کہ جس کے علم و فضل کے پیشِ نظر علامہ ابو الفضل جیسے حکیم اور دانش ور نے کہا تھا کہ اگر کہن نامہ ہائے دانش مفقود شوند، او اساسِ نو بر نہد!

عبدالباقی کا کہنا ہے کہ عبدالرحیم خانِ خاناں نے فارسی کا پورا دیوان مرتب کیا تھا۔لیکن شبلی کہتے ہیں کہ اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔البتہ اشعار کثرت سے جا بجا ملتے ہیں۔(۲۵)

عبدالرحیم خانِ خاناں کی فیاضیوں کے بارے میں شبلی لکھتے ہیں کہ نظیری نیشاپوری جب حج کر کے آیا تو کسی موقع پر اس کی زبان سے نکل گیا کہ میں نے لاکھ روپے کا ڈھیر نہیں دیکھا۔خانِ خاناں نے لاکھ روپیہ منگوا کر ڈھیر لگوا دیا۔نظیری نے شکریہ ادا کیا کہ آپ کی بدولت میں نے آنکھ سے لاکھ روپے کا انبار دیکھ لیا۔خانِ خاناں سے زیادہ حسن طلب کا اداشناس کون ہوسکتا تھا۔حکم دیا کہ روپے نظیری کے گھر پہنچا دیے جائیں۔(۲۶)

اس کی فیاضیوں کے چرچے عرب و عجم تک پھیلے ہوئے تھے۔شکیبی اصفہانی جب حج کرنے کی غرض سے عدن پہنچا تو بچے گیت گا رہے تھے کہ خانِ خاناں آیا جس کی بدولت کنواریوں نے شوہر پائے، تاجروں نے اسباب بیچے، بادل برسے، جل تھل بھر گئے۔(۲۷)

شبلی کہتے ہیں کہ عرفی، نظیری، شکیبی وغیرہ نے اکبر، جہانگیر اور مراد کی مدح میں اکثر قصیدے لکھے ہیں۔لیکن ان قصیدوں کو خانِ خاناں کے مدحیہ قصیدوں سے ملاؤ تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔خانِ خاناں کے مدحیہ قصائد میں صاف نظر آتا ہے کہ شاعر جوش اور اخلاص سے لبریز اور بادۂ کرم کے نشے میں چور ہے۔(۲۸)

شبلی کے مطابق وہ باوجود اقتدار اور عظمت کے حسنِ اخلاق کی مجسم تصویر تھا۔جس زمانے میں خانِ خاناں کا خطاب ملا ہے، چند نصیحت آمیز فقرے ایک کاغذ پر لکھ کر نوکروں کو دیے کہ جب مجھے

کسی بات یا کسی شخص پر غصہ آئے تو اس کو پیش کر دینا۔ چنانچہ کتنا ہی غیض وغضب میں ہوتا، اس کاغذ کے پیش ہونے کے ساتھ ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ (۲۹)

اس کتاب میں خان خاناں کی صرف خوبیاں ہی بیان کی گئی ہیں۔ اور یہی اس زمانے کا رواج تھا۔

مولانا ظفر علی خاں نے ڈریپر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ''معرکۂ مذہب وسائنس'' کے نام سے کیا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس کتاب پر بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں: اردو زبان کم رتبہ تصنیفات اور تراجم سے جس طرح روز بروز معمور ہوتی جارہی ہے، اس کے لحاظ سے اگر چہ اہلِ نظر پر مایوسی چھا گئی ہے، لیکن مدتوں میں ایک آدھ تصنیف یا ترجمہ ایسا بھی نکل آتا ہے جو مایوسی کی تاریکی میں امید کی جھلک پیدا کر دیتا ہے۔ زیر ریویو ترجمہ بھی اسی قسم کا ایک ترجمہ ہے۔ (۳۰)

مترجم (ظفر علی خاں) صاحب مشہور مترجم ہیں۔ ان کی کتاب خیابانِ فارس متداول ہو چکی ہے۔ دکن ریویو نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا، اس لیے ترجمہ کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کسی علمی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم نہیں ہو سکتا۔۔۔ مترجم اگر چہ بہت متین لکھنے والے ہیں لیکن کہیں کہیں سخیف محاورے آ گئے ہیں جو ایک علمی کتاب کے شایاں نہیں۔ مثلاً دم دبا کر، اڑنگے پر چڑھا کر، وغیرہ وغیرہ۔

مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف لکھی ہے، انہوں نے نوٹ میں اس کی اچھی طرح پردہ دری کی ہے۔ اور اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تندمزاج مولوی ہیں۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف ترجمہ کی بہت تعریف کی بلکہ ظفر علی خاں کے جذبہ ایمانی کو بھی سراہا۔

کتاب کا موضوع دنیا میں مذہب اور تحقیقاتِ علمی کا باہمی تعلق ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح مذہب نے علم پر بے انتہا ظلم وستم کیے اور بالآخر کس طرح ہر معرکہ میں شکستِ فاش کھائی۔ شبلی بتاتے ہیں کہ مصنف نے یہ سخت غلطی کی ہے کہ کتاب کا موضوع عام رکھا ہے اور بحث صرف عیسوی

مذہب سے کی ہے۔اس لیے اگر عیسوی مذہب نے علم پر زیادتیاں کیں اور بالآخر شکست کھائی تو اس سے عام مذہب کی نسبت کوئی نتیجہ کیونکر پیدا ہوسکتا ہے۔(۳۱)

ریویو کے آخر میں لکھتے ہیں: ہم نہایت فخر اور نہایت خوشی سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام نے کبھی حکماء اور فلاسفہ کو نقصان نہیں پہنچایا۔ فارابی، بوعلی سینا، خیام وغیرہ ٹھیٹ حکیم اور فلسفی تھے لیکن ۔۔۔نہ وہ زندہ جلائے گئے، نہ شکنجے میں کسے گئے، نہ ان کو کسی طرح کی تکلیف دی گئی۔خلفاء اور سلاطینِ اسلام نے ان کا نہایت عزت واحترام کیا۔۔۔محدثین اور فقہاء ان کا ذکر مدحیہ الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ فلسفہ کی کیا عزت کی جاسکتی ہے۔(۳۲)

جلد پنجم میں تاریخی مقالات ہیں۔علامہ ابنِ تیمیہ پر ایک خوبصورت مضمون لکھا ہے۔گو اس سے ان کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ان کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے شبلی کی انشاپردازی ابنِ تیمیہ کی شخصیت سے ہم آہنگ نہیں ہوپاتی۔لیکن جب 728ھ میں قیدخانہ میں علامہ کا انتقال ہوا تو شبلی نے نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔دل بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوجاتی ہیں۔اور علامہ ابنِ تیمیہ کے ارفع مقام کا شدید احساس ہوتا ہے۔شبلی لکھتے ہیں: دوشنبہ کی رات ذوقعدہ 728ھ میں وہ آفتابِ علم دنیا کے افق سے چھپ گیا اور تمام عالم میں تاریکی چھا گئی۔(۳۳)

بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے پہلی اولاد زیب النساء تھی۔۔شبلی نے اس کے حالات پر ایک نہایت دلچسپ آرٹیکل لکھا ہے جس میں حوالے دے کر ان واقعات کی تردید بھی کی ہے جو غلط طور پر شہزادی کے نام منسوب کیے گئے ہیں۔زیب النساء نے چھوٹی عمر ہی میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا جس پر اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفی انعام میں دی۔زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی۔1091ھ میں جب راجپوتوں نے عام بغاوت کی تو عالمگیر نے ان کی سرکوبی کے لیے اپنے بیٹے شہزادہ اکبر کو ایک عظیم لشکر دے کر جودھ پور کی طرف روانہ کیا۔لیکن راجپوتوں کے بہکانے سے شہزادہ خود باغی ہوگیا۔شہزادی زیب النساء اور شہزادہ اکبر حقیقی بہن بھائی تھے۔دونوں میں خط کتابت بھی تھی۔یہ خطوط پکڑے گئے اور بادشاہ عالمگیر نے زیب النساء کا چار لاکھ

روپے سالانہ کا وظیفہ بند کر دیا اور اس کے ساتھ تمام مال ومتاع ضبط کر لیا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قصور معاف کر دیا گیا۔(۳۴)

شہزادی زیب النساء نے شادی نہیں کی۔عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطین تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔شبلی لکھتے ہیں کہ اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے۔لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے۔خود عالمگیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النساء بیگم اور مہر النساء بیگم، سپہر شکوہ (پسر شہزادہ داراشکوہ) اور ایزد بخش (پسر شہزادہ مرادبخش) سے بیاہی تھیں۔(۳۵) حیرانی کی بات یہ ہے کہ شبلی جیسا عالم اور مؤرخ جس کی نگاہ میں سارا مغلیہ دور تھا، اس بات کو فراموش کر گیا کہ مغل شہزادیوں کی شادیاں یا تو ہوتی نہیں تھیں اور اگر ہوتی تھیں تو صرف مغل شہزادوں سے۔تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عالم گیر کی چار بیٹیاں زندہ رہ گئی تھیں۔دو کی شادی ہوگئی کیونکہ دو بھائیوں کے بیٹے ابھی زندہ تھے۔ان سے عالمگیر نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی کر دی۔باقی دو کی شادی نہیں ہوئی کیونکہ خاندان میں کوئی اور شہزادہ نہ تھا۔صرف یہ کہہ دینے سے کہ یورپین مصنفوں نے غلط روایات کو شہرت دی، حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔

زیب النساء نے 1113ھ میں انتقال کیا۔عالمگیر اس زمانے میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا۔یہ خبر سن کر سخت غم زدہ ہوا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔حکم ہوا کہ اس کے ایصال کے لیے خیرات دی جائے اور اس کا مقبرہ تیار کرایا جائے۔(۳۶)

تذکروں میں یہ دو شعر زیب النساء کے نام سے منقول ہیں[37]:

بشکند دستے کہ خم درگردنِ یارے نشد　　کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نہ شد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت　　غنچۂ باغِ دلِ ما زیب دستارے نہ شد

جلد ہفتم فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔مولانا شبلی نعمانی نے فلسفۂ یونان کے مقابلہ پر فلسفۂ اسلام کی کاوشوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور اس بیان کی دھجیاں بکھیر دی ہیں کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔انہوں نے پروفیسر رینان کے اس بیان کا پرزور رد لکھا ہے کہ اسلام اور علم دونوں

ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔لیکن اپنے مضامین میں وہ اس بات کونظر انداز کر جاتے ہیں کہ قرآن مجید سائنس سکھانے کے لیے نہیں بلکہ نظام حیات بتانے کے لیے نازل ہوا تھا اور یہ کہ تفہیم کے لیے وہ جو زبان استعمال کرتا ہے، وہ سائنس کی نہیں بلکہ عام استعمال کی زبان ہے۔اس سلسلے میں مولانا انور شاہ کشمیری نے ایک بہت ہی اہم امر کی طرف توجہ دلائی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ افہام و تفہیم میں دستور یہی ہے کہ عام مشاہدات کے مطابق تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں۔مثلاً اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ لیل ونہار کا انقلاب، زمین کی گردش کا نتیجہ ہے۔مگر اس کے باوجود سب اب بھی یہی کہتے ہیں کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے، وہ طلوع ہو رہا ہے، وہ سمت الرأس پر آ گیا۔اس نکتہ کو ذہن میں رکھنے سے قرآن فہمی میں آسانی ہوگی۔(۳۸)

آخری جلد میں متفرق مضامین ہیں۔چند مضامین میں (اور پہلی جلد میں بھی) میں وقف علی الاولاد کے موضوع پر مفصل بحث ہے۔شبلی اور جناح کا ایک بہت بڑا کارنامہ ''وقف علی الاولاد'' بل پاس کرانا ہے۔اسلامی شریعت کے مطابق اگر کوئی شخص اپنی جائداد کو خدا کی راہ میں فقراء اور غرباء کے لئے اس طرح مخصوص کر دے کہ اصل جائیداد ہمیشہ محفوظ رہے اور اس کا منافع فقراء اور غرباء کو ملتا رہے تو اس کا نام وقف ہوگا۔وہ جائیداد نہ فروخت ہو سکے گی، نہ ہبہ ہو سکے گی، نہ وارثوں کو مل سکے گی۔البتہ اس کا منافع غرباء اور فقراء کو ملتا رہے گا۔وقف کی یہ صورت دوسرے مذہبوں میں بھی موجود ہے۔لیکن اسلام نے اس کو وسعت دی۔اسلام کے مطابق کیونکہ اولاد کی پرورش انسان پر فرض ہے، اس لئے کوئی شخص صرف اپنی اولاد کے لئے کوئی جائیداد وقف کرے تو یہ وقف بھی جائز اور نافذ ہوگا۔اس کو ''وقف علی الاولاد'' کہتے ہیں۔

سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت پریوی کونسل نے 1894ء میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ ''وقف علی الاولاد'' غیر قانونی ہے۔اس پر مسلمانوں میں سخت ناراضگی پھیل گئی۔مولانا شبلی نعمانی نے ندوہ کے 1908ء کے سالانہ جلسے میں اس کے حق میں ایک قرارداد پاس کرائی اور پھر اس کی تکمیل کے لیے سرگرم اور باقاعدہ کوششیں شروع کر دیں۔انہوں نے اس کام کے لیے ندوہ کے زیر

حمایت ایک ''مجلسِ وقف'' قائم کی اور ملک میں اس کی تائید میں جابجا جلسے کرائے۔محمد علی جناح اس وقت لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔انہوں نے حکومت سے اس مسئلے پر استفسار کیا۔جواب ملا کہ حکومت اس مسئلے کے حق میں قانون بنانے کو تیار نہیں لیکن اگر کوئی غیر سرکاری ممبر اپنے طور پر بل پیش کرے گا تو گورنمنٹ اس پر غور کرے گی۔مسلمانوں کے جذبات اور مستند علماء کی رائے کے پیش نظر محمد علی جناح نے 17 مارچ 1911ء کو امپیریل کونسل میں ''وقف علی الاولاد'' سے متعلق ایک بل اس بنیاد پر پیش کیا کہ پریوی کونسل کا فیصلہ اسلامی فقہ کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کے اس رسالے کا خلاصہ پڑھ کر سنایا جو مولانا نے پریوی کونسل کے دلائل کے جواب میں اور اس مسئلے کی فقہی حیثیت کی تشریح میں لکھا تھا اور یہ بھی بتایا کہ مولانا شبلی کا مسلمانوں میں علمی پایہ کتنا بلند ہے اور ان کی وقعت کس درجہ ہے اور اس بنا پر ان کی رائے کا وزن کتنا ہوسکتا ہے۔اس رسالے کے اقتباسات حسب موقع جگہ جگہ سے پڑھ کر سنائے اور آخر میں بل کی دفعات کی تشریح کی۔حکومت نے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے اس بل کو مشتہر کیا۔یہاں اس بات کا ذکر کر دیا جائے کہ اس بل کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے میں مولانا شبلی کا بہت بڑا حصہ تھا۔اس سلسلے میں جناح سے رابطہ پیدا کرنے کا ثبوت ان کے دو خطوں سے ملتا ہے۔پہلا خط سید محمد محسن خاں بلگرامی کو بتاریخ 6 فروری 1911ء لکھا گیا۔اس خط میں شبلی لکھتے ہیں: مسٹر جینا (قائد اعظم کو اس دور میں محمد علی جینا بھی کہتے تھے) غالباً شرع کے موافق قانون بنائیں گے لیکن انہوں نے مجھ کو نہیں لکھا۔البتہ مسٹر مظہر الحق سے خط و کتابت ہے۔میں بمبئی جا کر مسٹر جینا سے ملوں گا۔اس کے بعد (اس خط میں تاریخ نہیں لکھی) دکن کالج، پونہ کے پرفیسر مولوی عبدالباری ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: وقف کے متعلق مسٹر جینا سے مفصل بحث ہوئی۔انجمنوں، اخبارات اور خطوط کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے کے علاوہ شبلی نے حکومت کے پاس ملک کے نامور لوگوں پر مشتمل ایک وفد بھی بھیجا۔اس سلسلے میں انہوں نے علامہ اقبال کو بھی خط لکھا۔علامہ اقبال نے 12 جنوری 1911ء کو جواب میں یہ لکھا: افسوس کہ ڈیپوٹیشن میں شریک ہونے سے قاصر ہوں۔اگر آپ کا ارشاد ہوتو میں چوہدری شہاب

الدین صاحب بی۔اے، وکیل چیف کورٹ سے دریافت کروں۔ وہ نہایت قابل آدمی ہیں اور اس کام کے اہل۔ اگر یہ پسند نہ ہوتو نواب ذوالفقار علی خاں اس وقت کلکتہ میں ہیں، آپ ان کو پنجاب کی طرف سے انتخاب کریں اور ان کو لکھ دیں کہ وہ 29 جنوری تک کلکتہ ہی میں ٹھہریں۔ مسٹر محمد شفیع بیرسٹر، لاہور بھی اس وقت کلکتہ میں ہیں۔ غالباً وہ آپ کے لکھنے پر 29 جنوری تک وہاں قیام کرسکیں گے۔ جو تجویز پسند خاطر ہو، اس کو عمل میں لائیے۔ علماء کی رائے حاصل کرنے کے بعد اس بل میں مناسب ترامیم کی گئیں۔ جناح نے ایک ممتاز مسلمان قانون دان کی حیثیت سے اس مسئلے میں بڑی دلچسپی لی اور امپیریل کونسل میں نہایت عمدہ انداز میں اس کی وکالت کی۔ آخر کار یہ بل کونسل میں منظور ہوا اور اس طرح مسلمانوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی جس کے لئے وہ سرسید کے زمانے سے کوشش کرتے چلے آرہے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی پرائیویٹ ممبر کی طرف سے پیش کیا جانے والا کوئی بل منظور ہوا ہو۔ اس بل پر کونسل کے غور کرنے کے دوران ہی جناح کی کونسل کی ممبر شپ کی معیاد ختم ہوگئی لیکن مسلمانوں کے پرزور مطالبے پر وائسرائے نے انہیں کونسل کا رکن نامزد کردیا جس سے بل پاس کرانے میں آسانی ہوگئی۔(۳۹)

اپنے طویل مضمون ''مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ'' میں مسلمانوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ہندوؤں کا سب سے بڑا جرم نیشنل کانگریس قائم کرنا تھا۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر مسلمان اپاہج بنے بیٹھے رہے۔۔۔ تو کیا ہندوؤں کا یہ فرض تھا کہ وہ بھی اپاہج اور بے دست و پا بن جاتے''۔(۴۰) افسوس، مولانا شبلی نعمانی یہ بھول گئے کہ انڈین نیشنل کانگریس ہندوؤں نے نہیں بلکہ ایک انگریز ہیوم نے قائم کی تھی!

خلاصہ کلام یہ کہ جوں جوں ایک قاری ان کے مقالات پڑھتا جاتا ہے، وہ ان کے علم کی وسعت اور گہرائی، ان کی ژرف نگاہی اور انشا پردازی کا قائل ہوتا جاتا ہے۔ انشا پردازی نے ان مقالات کو نہایت دلچسپ بنادیا ہے لیکن بنیادی چیز یہ ہے کہ مواد بھی موجود ہے۔ بغیر مواد کے انشا پردازی ایسے ہے جیسا کہ پیتل کے بت پر سونے کا پانی۔ ہم ادب کے پہلو سے دیکھیں یا مذہب کے

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھیں یا تاریخی، قرآن کی حکمت کی بات ہو رہی ہو یا فارسی شاعری کا بیان، ان کا قلم ہر موضوع کے مطابق اپنے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز رہتا ہے۔ کسی موضوع پر مقالہ لکھتے وقت ان کا خیال ستاروں کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے اور گوہر مقصود کے حصول کے لیے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی اتر جاتا ہے۔ برصغیر میں کوئی اور اتنی متنوع شخصیت نظر نہیں آتی۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان کی علمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

1۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد اول): 210-220

2۔ محولہ بالا (جلد اول): 26-27, 37-38

3۔ ۔ محولہ بالا (جلد اول): 30-31

4۔ انور شاہ کشمیری بحوالہ ''نقشِ دوام'' (''حیاتِ کشمیری'') از نظر شاہ مسعودی: 298, 356

5۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد اول): 82-104

6۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد دوم): 57

7۔ ۔ محولہ بالا (جلد دوم): 61

8۔ ۔ محولہ بالا (جلد دوم): 64

9۔ ۔ محولہ بالا (جلد دوم): 55

10۔ ۔ محولہ بالا (جلد دوم): 15

11۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد سوم): 1-3

12۔ ۔ محولہ بالا (جلد سوم): 6

13۔ ۔ محولہ بالا (جلد سوم): 7

14۔ ۔ محولہ بالا (جلد سوم): 16-17

15۔ ۔ محولہ بالا (جلد سوم): 36

16۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد سوم): 36

17۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن: 25

18۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد چہارم): 1-2

19۔ ۔ محولہ بالا (جلد چہارم): 42-45

20۔ حافظ ابنِ حجر بحوالہ ''یادگارِ شبلی'' از ایس۔ ایم۔ اکرام: 263

21۔ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن (جلد اول): 46-47

22۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد چہارم): 52-57

23۔۔محولہ بالا (جلد چہارم): 58-61

24۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد چہارم): 65-67؛ عبدالرحیم انصاری: 120

25۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد چہارم): 67-68

26۔محولہ بالا (جلد چہارم): 71-72

27۔محولہ بالا (جلد چہارم): 72

28۔محولہ بالا (جلد چہارم): 74

29۔محولہ بالا (جلد چہارم): 77

30۔محولہ بالا (جلد چہارم): 168-169

31۔محولہ بالا (جلد چہارم): 169

32۔محولہ بالا (جلد چہارم): 177

33۔محولہ بالا (جلد پنجم): 84-86

34۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد پنجم): 111-112

35۔۔محولہ بالا (جلد پنجم): 113

36۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد پنجم): 114

37۔۔محولہ بالا (جلد پنجم): 115

38۔انور شاہ کشمیری بحوالہ ''نقشِ دوام'' (''حیاتِ کشمیری'') از انظر شاہ مسعودی: 339-340

39۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد اول): 82-103، مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم): 15-23، 27-29؛ سٹینلے والپرٹ: 33؛ شریف المجاہد: 5-6؛ جی۔الانا: 93؛ ہیکٹر بولیتھو: 54, 84؛ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی (حصہ اول): 309، مکاتیبِ شبلی (حصہ دوم): 153

40۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم): 171

کتابیات

1۔ایس۔ایم۔اکرام، یادگارِ شبلی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، 2۔کلب روڈ، لاہور۔طبع دوم: 1994ء

2۔انظر شاہ مسعودی، نقشِ دوام (حیاتِ کشمیری)، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔

3۔الانا، جی، قائداعظم محمد علی جناح ایک قوم کی سرگزشت، مترجم: رئیس امروہوی، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔

4۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (جلد اول تا پنجم و جلد ہفتم تا ہشتم مرتبہ سید سلیمان ندوی اور جلد ششم مرتبہ مولوی مسعود علی ندوی)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔

5۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی (حصہ اول و دوم) مرتبہ سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔ 1989ء

6۔ ڈاکٹر شیخ عبدالرحیم انصاری، شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ، ڈاکخانہ رہلہ، ضلع پلاموں۔ 1990ء

7. **Allana, G.** Quaid-e-Azam Jinnah: The Story of a Nation. Ferozsons, Ltd., Lahore, 1967.

8. **Bolitho, Hector.** Jinnah: Creator of Pakistan. John Murrey, London, 1954.

9. **Mujahid, Sharif al.** Quaid-i-Azam Jinnah: Studies in Interpretation. Quaid-i-Azam Academy, Karachi. Second revised edition, November 1981.

10. **Wolpert, Stanley.** Jinnah of Pakistan. Oxford University Press. Karachi. 1989.